بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اشارات

دعوتِ اسلامی اور غلبۂ شریعت کی برسوں لمبی جدوجہد کرتے کرتے اب یہ تلخ حقیقت خاص خاص افراد تک محدود نہیں رہی، بلکہ اسلامی رجحان کے ہر شخص اور جماعت کو محسوس ہونے لگی ہے کہ ہمارے راستے میں آہنی دیواریں حائل ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے اس کا اشارہ کیا ہے۔ مارشل لاء کے بعد بحالیٔ جمہوریت، انعقادِ انتخابات اور پارلیمانی کارروائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت سادہ طبع لوگوں میں بھی یہ طرزِ فکر اُبھر آیا ہے اور بہت زیادہ مستحکم و مدلل ہو گیا ہے کہ ہم لوگ جاگیرداری، سرمایہ پرستی اور بیوروکریسی کے اہرام نما قفسِ مثلث میں اسیر ہیں اور یہ قفس سامراجیت کی شاخ پر ٹنگا ہوا ہے۔ یہ حالت جب سمجھ میں آ جائے تو پھر یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ آج تک اگر احیائے اسلام کے لیے کوئی اہم کام نہیں ہو سکا (پاکستان کا مطلب اجتماعی عملی زندگی کی لغت میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه نہیں نمودار ہوا)۔ اُردو کو قومی زبان کی حیثیت نہیں مل سکی، وحدت و سالمیت پاکستان کے خلاف لسانی، علاقائی، نسلی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کے حملے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں تو یہ قدرتی نتیجہ ہے اُس صورتِ حالات کا جس میں ہم مبتلا ہیں۔ ظاہراً کوئی غلامی موجود نہیں ہے۔ مگر حقیقت میں ہم غلامی کی برف آمیز دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔ ظاہراً کوئی زنجیریں لپٹی ہوئی نہیں ہیں، مگر نئی اَن ٹوٹ زنجیریں اس لحاظ سے خطرناک ہیں کہ یہ دکھائی نہیں دیتیں اور انہوں نے ہماری تعلیم، معیشت، سیاست، ادب اور ثقافت میں اپنی جڑیں گہری اُتار دی ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ان جڑوں کے سرے ہمارے دل و دماغ کے خلیوں سے جا جڑے ہیں۔

اِس نقشۂ احوال نے زندگی کے تمام شعبوں اور اداروں پر آسیبی سایہ ڈال دیا ہے۔

سُپر پاورز ـــــ کوئی دوست بن کر اور کوئی مخالف بن کر عجیب پارٹ ادا کر رہی ہیں۔ پہلے دوست امریکہ کو لیجیے۔ اجمالاً آپ دیکھتے ہیں کہ ہمیں بار بار قرض لینا پڑتا ہے، دفاعی سامان مانگنا پڑتا ہے، وہاں ناک رگڑوائی جاتی ہے۔ اسرائیل اور بھارت کی پروپیگنڈا مشینری اور سفارتی نظام مل کر ہمیں اچھی طرح خراب کرتے ہیں۔ بلکہ خود امریکہ کی سفارتی اور پارلیمانی فضا یہ چاہتی ہے کہ پاکستان کے سرِ خودداری میں کیلیں ٹھونکی جاتی رہیں۔ پھر کچھ ملتا ہے تو اس کے ساتھ "دوستی" شامل ہوجاتی ہے۔ مگر دوستی بنیئے کی دوستی ہے، وہ جو کچھ دیتا ہے اس سے زیادہ لے کر اور ہمیں جگہ جگہ استعمال کر کے بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

وہ تھوڑا سا اسلحہ اور مالی امداد ہمیں دے کر پھر جلدی سے بھارت کو راضی کرنے چل پڑتا ہے اور اس کی جھولی ڈالروں اور اسلحہ سے خوب بھرتا ہے، بلکہ ساتھ ٹیکنالوجی بھی مہیا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ صرف اس لیے دیا جاتا ہے کہ بھارت پر جب اسلحہ اور ڈالر دل کھول کر نچھاور کیے جائیں تو کہیں پاکستان کو خطرہ محسوس نہ ہونے لگے اور یہ کارروائی بُری نہ لگے۔ یہ گویا پہلے سے منہ بند کرنے کی حکمتِ عملی ہے۔

گویا مستقبل کی کسی بڑی جنگ کی تیاری یوں ہو رہی ہے کہ بھارت کو رُوس بھی بہترین سازو سامان سے لیس کر رہا ہے اور امریکہ بھی اپنی اعلیٰ جنگی ایجادات فراہم کر رہا ہے۔ ساتھ ساتھ اسے بحری طاقت بھی بنایا جا رہا ہے۔ مقصد اتنا ہی نہیں کہ خوب سہارا دے کر بھارت کو ایک سپر پاور بنا دیا جائے اور جنوبی ایشیا میں اس سے پولیس کا کام لیا جائے۔ بلکہ آگے کا سوچا ہوا خفیہ منصوبہ یہ ہے کہ جب کبھی آئندہ بڑا معرکہ چھڑے تو امریکہ و رُوس اپنی اپنی جگہ اور اسلام اور مسلمانوں سے گہری نفرت رکھنے والا بھارت اپنی جانب سے علاقے کی اس خطرناک پٹی کا صفایا کردے جہاں بالفاظ دشمناں "بنیاد پرست" مسلمان جارحیت پسند اسلام کا علم اُٹھا رہے ہیں ـــ یعنی پاکستان، افغانستان اور ایران کا علاقہ ـــ اور پھر آگے بڑھ کر اسرائیل کے

تعاون سے مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ و ترکی کے مسلمانوں کی تباہی کا سامان کیا جائے۔ بیچ میں چین سے یا تو روس اور بھارت کی مصالحت ہو جائے یا اُس کو بھی لپیٹ میں لے لیا جائے۔ اُوپر جو لفظ "صفایا" لکھا گیا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ زمین کا یہ ٹکڑا ہی غائب ہو جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کی آبادی کو خوب کچلا جائے۔ اور ان میں اگر اسلامیت باقی رہے تو ایک بے جان لوتھڑے کی شکل میں رہے۔ بلکہ کسی کسی کے سینے میں آہِ نارسا بن کر۔

اِس خوف ناک امکانی تصور کو سامنے لاتے ہوئے ہم ہرگز کسی خوف یا مایوسی میں مبتلا نہیں ہوں اور نہ کسی قاری کو ہونا چاہیے۔ کیونکہ دُنیا میں دینِ حق اور علمبردارانِ دینِ حق کے وجود پر رولر پھیرنے کے لیے بارہا کئی انسان کُش اور تہذیب سوز سازشیں بنیں۔ مگر ہر سازش کی نہایت اہم ڈوریاں مشیت نے یکایک کسی تاریخی حادثے کے ہتھیار سے کاٹ دیں۔ اگر یوں نہ ہوتا تو نہ اسلام نام کے دین کا نام و نشان کہیں ملتا اور نہ مسلمان نامی ملّت کا وجود ہوتا۔ (خدا آئندہ بھی بچائے)

فتنۂ تاتار، صلیبی جنگیں اور مغربی شہنشاہیت کی ظالمانہ تباہ کاریاں اگر دین و ملّت کو نہ مٹا سکیں تو آئندہ کون سی سازش اور کون سا ظلم خاتمہ کر سکتا ہے۔

اِس طرح کے امکانات کا سدِباب اور غیر مرئی زنجیروں میں جکڑے رہنے کی مصیبت سے نجات کا واحد راستہ سچے عقیدے اور روشن نصب العین کے سہارے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے۔ اگر ہم فیصلہ کر لیں کہ کسی سپر پاور کے مزارع بن کر ہم نہ رہیں گے۔ اور کسی ایک کی گود سے اُٹھ کر کسی دوسرے کی گود میں نہ جا بیٹھیں گے (جب کہ بہت سے دانشور محض سرپرست اور گود کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں) اور یہ فیصلہ کر لیں کہ قرضوں کے تمام بندھن کاٹ کر چھوڑیں گے، خواہ اس کے لیے پیسہ پیسہ کر کے قوم سے چندہ لینا پڑے، خواہ وزیروں اور امیروں کو خاص طور پر فاقہ کشی کرنی پڑے، چاہے معیارِ زندگی کو گرانا پڑے ——— اور یہ فیصلہ کر لیں کہ اپنی ضرورت کا اسلحہ (خاص طور پر انتہائی جدید دفاعی سامان) ہم کھلی مارکیٹ

سے یا خفیہ مارکیٹ سے مہنگے دام خرید کر جن کام چلائیں گے، اور یہ فیصلہ کرلیں کہ قوم کے اندر جو وجوہِ انتشار اور وجوہِ بے اطمینانی کارفرما ہیں ان کا ازالہ کردیں گے تو سامراجیت کی فکری، تہذیبی، اقتصادی اور دفاعی غلامی کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں میں دفاع کی قوت بڑھانے کے لیے سچی خدا پرستی، قیامِ اسلام کے لیے جدوجہد، پاکیزہ اخلاق کی فضا اور محلہ بہ محلہ تنظیموں کے لیے نوجوانوں کو اعلیٰ مقصد پر لگانے اور فوجی اسپرٹ کے ساتھ متحرک رکھنے کی ضرورت ہے۔

مگر اس کے لیے جیسے لیڈر چاہئیں اور جیسی حکومت چاہیے، اس کے بغیر یہ خواب، خیال و محال و جنون ہے۔

ہمیں سُپر پاورز کے چنگل سے نکلنے، اسلامی ریاست و معاشرہ قائم کرنے اور ظلم و استحصال کے کولہو میں پسنے والی اور جادہ ہائے معیشت میں چیونٹیوں کی طرح روندی جانے والی مخلوق کو بچانے کے لیے صداقت پسند، جرأت کیش، دیانت دار، پاک نگاہ اور ایثار پیشہ لیڈروں کی ٹیم کی ضرورت ہے۔ مگر ایسی قیادت کے ظہور کا سدِباب کرنے کے لیے ہماری ممتاز استحصالی قوتوں نے گٹھ جوڑ کرکے ایسی سیاست، ایسی جماعت سازی، ایسے طریقِ انتخاب اور معیارِ انتخاب اور ایسے پارلیمانی طریقِ کار کو قوم کے سر ٹھونس رکھا ہے کہ اس "ہیجینیو لائن" کے ہوتے ہوئے اس بات کا قطعاً امکان نہیں ہے کہ ایمان اور علم و کردار رکھنے والے معزز شہریوں کی ایک مؤثر ٹیم اقتدار کے محل میں جا داخل ہو۔ قدم قدم پر جو رکاوٹیں اس جادۂ سیاست و انتخاب میں ہیں، ان کے ہوتے ہوئے زیادہ سے زیادہ یہی ممکن ہے کہ اکا دکا اسلامی ذہن و کردار کے اچھے لوگ بھی میخانہ جاہ میں جا داخل ہوں، یا پھر یہ کہ اگر کچھ قواعد شکنی کرکے، کچھ اپنی اخلاقی پابندیوں کو کم کرکے اور مفاد کے تالاب میں ڈبکیاں لگانے والے لوگوں میں سے کچھ کے ساتھ غلط سلط طریق سے (کچھ دو اور کچھ دو کے اصول پر) گٹھ جوڑ کرکے دس پانچ کی ٹولی اوپر جا پہنچے اور بعد ازاں کچھ اچھی آوازیں بلند کرنے کے ساتھ جبر کیش اکثریت کی اندھی، متعصبانہ اور

تمسخرانہ مخالفت کا نشانہ بنے۔

تاہم یہ کوشش بھی ایک اچھا پہلو رکھتی ہے، وہ یہ کہ قومی اور صوبائی ایوانوں سے اسلام کی آواز دُنیا بھر میں سُنائی دے سکتی ہے اور ملک کے عوام میں سے کچھ نہ کچھ تعداد کو اس کی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے، نیز موجودہ سیاسی اور پارلیمانی نظام کی ساخت میں اور اس کے شرکاء میں جو کمزوریاں ہیں، ان کو واضح کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ آج یہ حقیقت واشگاف ہو کر سامنے آگئی ہے کہ دینِ حق کو ماننے کے بعد ہمارے خداوندانِ سیاست کی روش کیا ہے۔ کتاب و سنّت کے ہوتے ہوئے ان کی مخالفت کا راستہ اختیار کرنا، اُن کے مقاصد کو تباہ کرنے والے اداروں اور ثقافت اور شعائر و اقدار کی ترویج کرنا، یا ان کی تعلیمات سے بے اعتنائی برتنا، یا ان کے واضح اور قطعی احکام کی مضحکہ خیز معنویتیں بیان کرنا، یا زمانے کی تبدیلی اور اجتہاد کے نام سے قرآن و حدیث کے الفاظ و معانی میں عبرت انگیز ردوبدل اور تحریف کرنا، یا بعض اوقات کسی فرد یا جماعت یا کسی واقعہ کو سامنے رکھ کر اس کی آڑ میں دین پر پھبتیاں کسنا، دلائل سے کام لینے کے بجائے خوب شور مچانا اور بالآخر محض ووٹوں کی عددیت کے بل پر حق اور باطل، جائز اور ناجائز، تخریب اور تعمیر، نفع اور نقصان، عدل اور بے انصافی کا تصفیہ قانون اور پالیسی کی شکل میں کر دینا، یہ سب کچھ ہماری سیاست، جمہوریت یا حکمرانی کا نہایت غیر صحت مندانہ نقشہ ہے۔

زیادہ تکلیف دہ صورتِ حالات یہ ہے کہ اسلام کے نعرے اور قیامِ اسلام کے وعدے کو عوام کے دل بہلاوے کے لیے برسوں استعمال کر کے اسلام گریز قوتوں نے اسے قطعی طور پر غیر موثر بنا دینے اور لوگوں کو خاصا مایوس کر دینے کے بعد اب "اسلامی سیکولرازم" اور "سیکولر اسلام" کے ناقابلِ فہم تصور کو قوم پر ٹھونسنے کے لیے مختلف ہتھکنڈوں سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ ایک طرف دانشوروں کی ٹیم، دوسری طرف ذرائع ابلاغ، تیسری طرف ماڈرن خواتین اور چوتھی طرف حکومت کی اسلام گریز پالیسیوں کو ہم چاروں طرف سے مصروفِ عمل دیکھتے ہیں، جن کی پُشت پناہی سامراجی قوتیں اور تمام علمبردارانِ تہذیبِ الحاد اور جملہ دشمنانِ احیائے اسلام کر رہے ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ گورباچوف رگین کو اسلامی بنیاد پرستی (یا احیائے اسلام)

کا سدِّ باب کرنے کے لیے متوجہ کرنے والے ہیں۔ درآنحالیکہ امریکہ تو پہلے ہی کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کے ساتھ مصر میں "بنیاد پرستی" کو حکومت سے کچلوانے کا منصوبہ دے چکا ہے اور وہ اُس وقت آؤٹ بھی ہو گیا تھا۔ اور اس پر عمل بھی ہوا۔ اسی طرح رُوس اپنے ہاں پہلے ہی کئی مُسلم ریاستوں کو ختم کرنے کے ساتھ جبری الحاد کے ذریعے اسلام کو بھی کچل چکا ہے اور اب اس کی نوآبادیوں اور زیرِ اثر ممالک میں اسلام دشمنی اور مُسلم دشمنی کا عمل تیز تر ہو رہا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ یہ طرح طرح کے جو سیاسی ڈرامے ہم شروع سے دیکھتے آ رہے ہیں، ان کا کوئی سین اکثریتی جبریت کے نام سے ہو، کسی شخصی آمریت یا کسی جتھے کے استبداد کا ہو، مارشل لا، یا جمہوریت بہ سایۂ بند و بستِ جرنیلی ہو، یا جماعت سازی کے کسی مصنوعی کھوکھلے ڈھانچے کے سہارے اختلافی قوتوں اور اقلیتی اپوزیشن کی دُھنائی کرنے کا دستوری و پارلیمانی اہتمام ہو، ان تمام صورتوں میں ہمارا اصل اور مستقل حکمران وہی "ٹنگڈم" رہا ہے جو جاگیرداری، سرمایہ پرستی اور بیوروکریسی سے مل کر بنا ہے۔ اس ٹنگڈم کو جب ضرورت ہوتی ہے تو یہ آمریت کا پیرایہ اختیار کر لیتا ہے، جب دوسری طرح کی ضرورت ہوتی ہے تو مارشل لا کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور جب کبھی بہت مجبوری ہو تو جمہوریت کا کھیل شروع کر دیتا ہے۔ اس قوت کو پچھلے ادوار میں غنڈوں کی مختلف ٹولیوں کا، اور اب بعض صوبوں میں جرم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ نیز یہ قوت بڑے غیر محسوس طریقوں سے آزاد پریس کو بھی اپنی زلفوں میں اسیر رکھتی ہے۔ خود پریس پر ایسے لوگوں کا تسلط ہے جو اسلام گریز اور لادینیت پسند ہیں۔

جہاں تک اسلام کے راستے میں چٹانیں لالا کے ڈالنے اور خاردار تاریں لگانے کا معاملہ ہے تو اس خاص "نیک" کام میں ان کو کئی اطراف سے امداد ملتی ہے۔ اوّل تو سپر پاورز اور اہلِ مغرب کی طرف سے ہلاشیری ہوتی ہے اور اظہارِ خوشنودی[1]، پھر تمام کمیونسٹ اور لادینیت پسند حضرات، اباحیت پسند گروہ، عیسائی دوست، قادیانی مہربان، جو اوّل روز

---

[1] یہاں اکبر الٰہ آبادی کا شعر یاد آتا ہے:

میرے اسلام کو اب قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے مِس بولی تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

سے غیر پرستی، جاسوسی، سازش کاری اور تفرقہ انگیزی کے ماہر ہیں۔ اور اب تخریب کارانہ حرکتوں میں اسرائیلیوں کے بھی کان کترتے ہیں) اور ملک کی مسلمان اکثریت سے بنیادی اختلاف رکھنے والے کٹر اور متعصب فرقے سب اسلام دشمنی کے ایک ہی حمام میں بے لباس ہیں۔[1]

اسلام تو رہا ایک طرف، یہاں تو واحد پاکستانی مسلم قومیت نہ پنپ سکی، اُردو کو چالیس سال میں اس کا مقام نہ مل سکا، نہ عوام کا معاشی مسئلہ دسویں حصے تک بھی حل ہو سکا جسے بعض لوگ قائداعظم اور علامہ اقبال کے حوالے سے اصل مقصدِ پاکستان قرار دیتے ہیں اور اسی مقصد کو اسلامی نظریہ و تحریک کے توڑ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ معاشی ترقی اور اسلامی احیا دونوں ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں۔ اِسی طرح یہ بھی نہ ہو سکا کہ بڑے معاندین کی زد میں رہنے والی یہ قوم اپنے تحفظ، اسلام کے عروج اور پاکستان کے استحکام کے لیے ایک مجاہد قوم بن گئی ہوتی، جس کا بچہ بچہ جذبۂ جہاد سے سرشار ہوتا اور جس کے جوان تعلیم گاہوں میں اور محلوں میں منظم ہو کر دفاعی تربیت حاصل کرتے۔ نہ ایسا ہی ہو سکا کہ ہم اپنی قوت میں سائنسی تحقیقاتوں کے ذریعے نت نیا اضافہ کرتے۔ فزیکل، فزیالوجیکل کیمیکل انجینئرنگ کے دائروں میں نئے نئے انکشافات و اکتشافات اور ایجادات سے ہم دائرہ امن کے لیے بھی اور دائرہ جنگ کے لیے بھی ایسی قوتیں فراہم کرتے جن تک ابھی دوسروں

---

[1] ہمارے کارپردازوں نے اضافہ آبادی کی سیاسی معنویت کو نظرانداز کر کے تلقینِ مغرب اور مالی امداد کے تحت خاندانی منصوبہ بندی کی جو اسکیم شروع کر رکھی ہے، اس کا اثر یہ نمودار ہو رہا ہے کہ اسلام دشمن قوتوں میں تو نسلی بڑھوتری تیزی سے ہو رہی ہے اور سارا نزلہ مسلم اکثریت پر گر رہا ہے۔ آخر نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمان پاکستان میں اقلیت بن جائیں گے۔ حضراتِ اکابر کبھی خفیہ طور پر مختلف گروہوں کی رفتارِ اضافہ کا ریکارڈ مرتب کر کے دیکھیں۔

کی رسائی ہو ہی نہیں پاتی۔

مگر بدقسمتی سے معاشی اور مادی قوت کا پہیہ بھی اُلٹا گھومتا رہا۔

صنعت کا حال پرائیویٹ سیکٹر میں یہ ہے کہ بڑے بڑے کارخانوں کے سرمایے ختم ہو چکے ہیں اور خسارہ در خسارہ کے سلسلے کو پورا کرنے کے لیے بنکوں کے سرمایے کام کر رہے ہیں۔ پبلک سیکٹر کی اکثر صنعتیں خساروں اور مقروضیت کے روگوں میں مبتلا ہیں۔ اور پھر صنعتوں کو خیانت کے منہ میں بھی سونے کے لقمے ڈالنے ہوتے ہیں۔

نئی صنعتیں کھولنا اس لیے مشکل ہے کہ اتنے قانونی تقاضے، دفتروں کے چکر، رشوتوں کے مطالبے اور سر پر لٹکتی ہوئی ٹیکسوں کی تلواریں، صنعتی خام مال کے سلسلے میں بعض درآمدوں کی مشکلات، پھر بیرونی مصنوعات کی اعلیٰ معیاریت اور قیمت کی ارزانی کا مقابلہ، پھر باڑہ مارکیٹوں کی قانونی اسمگلنگ کا مقابلہ، پھر جاپان اور چین کی مہروں کے ساتھ کوریا، ہانگ کانگ، سنگاپور اور خود پاکستان میں بنی ہوئی جعلی چیزوں (خصوصاً موٹر سپیئر پارٹس) وغیرہ کا دباؤ۔ ان حالات کے گھیرے میں کوئی نوخیز صنعت کس طرح سر اُٹھا سکتی ہے۔ کئی صنعتیں شروع ہو کر ختم ہو گئیں۔

دوسری طرف بنکوں کی پُرکشش اسکیموں، طرح طرح کے انعامی بانڈز، سرٹیفکیٹوں اور مختلف فنانشل منصوبوں، تعمیراتی پروگراموں، قسطوں کے کاروبار وغیرہ نے باہر سے آنے والے سرمایوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے پوری اشتہاری قوت لگا دی ہے۔

کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں اُٹھتا جو اقتدار کی قوت سے آراستہ ہو کر اس ساری صورتِ حالات کا بے لاگ جائزہ لے کر اصلاح احوال اور تعمیر معیشت کی اسکیموں کو روبعمل لاتے۔

زراعت کا قصہ بھی عبرت آفریں ہے۔ بیج باہر سے، مشینیں اور آلات باہر سے، کیڑے مار دوائیں باہر سے، پانی کے کھالے بنانے کے لیے رقمیں بیرونی قرضوں کی، اُوپر سے قدرت کی ناراضی کا یہ عالم کہ دو سال سے موسموں کا نظام تلپٹ، وقت پر بارشیں غائب، بے وقت جل تھل کا عالم، اب ضروری غذائی اجناس کی درآمد اور زرعی برآمدات میں کمی درپیش ہے۔

مجموعی معاشی حالات کو اگر آپ اعداد و شمار کے ڈائل پر غور سے ملاحظہ کریں تو اوّل تو یہ

دیکھیے کہ آپ کے سکے کی قیمت میں کتنی کمی آچکی ہے۔ افراطِ زر کی پرواز کہاں تک جا پہنچی ہے اور گرانی کا پیمانہ کیا ہوگیا ہے۔ پھر دیکھیے کہ بجٹ میں خسارہ ہے، تجارتِ خارجہ میں بھاری خسارہ ہے، سرکاری ریزور فنڈ اور زرِ مبادلہ میں گھاٹا ہے، حتیٰ کہ اب دفاع میں بھی ۷ ارب روپے کے مصارف کم کرنے سے معاشی بدحالی کا بدنما چہرہ اور زیادہ بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

لیکن اربابِ اقتدار جس طرح پہلے لکھ لُٹ ہوا کرتے تھے، اسی طرح اب بھی ہیں۔ بلکہ اب پارلیمانی ارکان کے ذریعے قومی دولت کا ایک بڑا حصہ ایسے طریق سے خرچ کروایا جاتا ہے کہ آگے کے انتخابات میں بھی برگ وبار دے سکے۔

سرکاری اقامت گاہوں، ان کے فرنیچر اور قالینوں، گاڑیوں اور ٹیلی فونوں اور دوسرے وسائل (حتیٰ کہ اسٹیشنری تک) کا ناجائز استعمال اور سرکاری ملازمین سے گھریلو خدمات لینے کا رواج، سفروں کے اخراجات، بیرونِ ملک سفر کرنے اور اپنے لیے اور اپنے اقربا کے لیے غیرملکی مہنگے علاج کرانے وغیرہ کے معاملات ایسے ہیں کہ ہمارے غریب ملک کو پنپنے نہیں دیتے۔

غالباً ہمارے اکابر کے سیاسی ہدایت نامے میں یہ سبق بھی لکھا ہوا ہے کہ غریب عوام کو جتنا زیادہ مبتلائے مصیبت رکھو گے اتنا ہی اچھا دَور گزار سکو گے۔ چنانچہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جس طرح جامن بیچنے والا چھلنی کے طرح چھیدے ہوئے ٹین کے ایک ڈبے میں جامنوں کے ساتھ نمک مرچ ڈال کر مسلسل جھٹکے دیتا ہے، بالکل اسی طرح ہمارے عوام جامن بنے ہوئے زخم بھی کھاتے ہیں اور نمک بھی لگواتے ہیں۔

قرضوں کا حال یہ ہے کہ اب ہم اربوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور اس جال کے حلقوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہماری کوئی اسکیم بیرونی قرض کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اور ہمارے سارے دفاع کی رگ گلو انہیں قرضوں کے چنگل میں ہے۔ عالمی مہاجن ہماری رگِ گلو کی رسّی کھینچیں تو سانس لینا مشکل ہو جائے۔ اور ڈھیلی چھوڑ دیں تو پھر قومی قرض کا استعمال ایسے ایسے غیانت کارانہ طریقوں سے افراد کے مفاد کی خدمت کے لیے ہونے لگے کہ پوری قومی معیشت تہس نہس ہو جائے۔ ان قرضوں کے بَل پر کوئی ترقی حقیقی معنوں میں کبھی نمودار نہیں ہوئی، بلکہ ہمارے نظام

میں روز بروز رخنے پڑتے چلے گئے۔ ہماری اُمنگوں کے محل کو دیمک چاٹ رہی ہے۔ ہماری تمام اسکیمیں اور قرضے ہمارے اپنے اختیار میں نہیں ہیں، بلکہ ان کا دارومدار دوسروں کی نوازشوں پر ہے۔ ہمارے کارپرداز ہمیں بے بس کرنے کے لیے شاید قرضوں کی زنجیروں میں ہمیں جکڑوانا پسند کرتے ہیں۔

متذکرہ خرابی احوال پر قابو پا سکنے والی مؤثر قوتیں تمام کی تمام معیارِ زندگی کی سڑک پر دولت شہرت اور عزت کی ہر آن تیز ہوتی ہوئی دوڑ میں لگی ہیں۔ اور ان کی دیکھا دیکھی درمیانہ طبقے کے لوگ بھی اور اُن کے پیچھے عوام بھی ــــ مرد اور عورتیں ــــ سب اس مجنونانہ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ معیارِ زندگی جتنا جتنا بڑھتا ہے، زندگی اتنی اتنی گھٹتی ہے، دولت جس رفتار سے زیادہ ہوتی ہے، ایمانوں کا افلاس بھی اسی رفتار سے زیادہ ہوتا ہے۔ شہرت اور نام نہاد عزت کے مقابلے میں جتنی بلندی حاصل کی جاتی ہے، انسانیت میں اتنی ہی پستی آجاتی ہے۔

کہیں یہ دوڑ کمانے اور کمائی کو بڑھانے کی ہے، کہیں یہ شو بزنس میں اُبھرنے کی ہے، کہیں تعلیمی میدان میں آگے نکلنے کی ہے۔ کہیں آزادیٔ نسواں کی شکل میں ہے اور نت نئے فیشنوں اور اسبابِ آرائش کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ کہیں اخبارات میں بڑی بڑی ہوس انگیز رنگین تصویروں اور اداکاروں اور موسیقاروں کی نجی زندگی کی خبریات کی اشاعت کا مقابلہ ہے، کہیں ثقافت اور مینا بازاروں اور فینسی ڈریس شو کے تماشے ہیں۔

کمال یہ ہے کہ اس دوڑ میں آگے نکلنے والے پیچھے والوں کو سہارا نہیں دیتے، بلکہ دوسروں کے لیے (خصوصاً نیچے کے کمزور طبقوں کے لیے) راستہ بند کرنے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی ۵۰ سال پہلے کے غریب خاندان کے بچے کی طرح اب یہ ممکن نہیں کہ ایک لڑکا اُٹھے اور محنت کے زور سے امتحانات پاس کرکے امرا کی اولادوں کو پیچھے چھوڑ دے۔ اب غریب نوخیز طالب علم کے لیے تعلیم الگ ہے، اعلیٰ مراتب کو سنبھالنے والے طبقوں کے بچوں کے لیے الگ۔ کسی غریب بچے کے لیے ممکن نہیں کہ مختلف قسم کی رکاوٹیں عبور کرکے اچھے جادہ تعلیم پر پڑ سکے۔ غریب

کا بچہ اگر تعلیم پا جائے تو کسی عہدے پر تو کیا سوال، کسی اچھی ملازمت کے حصول کی کشمکش میں بھی وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسی طرح ایک طرف وہ لوگ ہیں جو دائمی طور پر ملک کے ذرائع و وسائل کے اجارہ دار بنتے جا رہے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ ہیں جو مستقلاً ان کی غلامی پر مجبور رہیں۔ اوّل الذکر کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے اور موخر الذکر بڑھ رہی ہے۔ دونوں کا فرق بڑھتے بڑھتے کچھ عرصے تک وہاں تک جا پہنچے گا کہ نچلا کثیر التعداد طبقہ شودروں کی طرح بیگار کرتا رہے گا۔ اور بھوکوں مرے گا۔

اس دوڑ میں خیانت بھی آ دخل دیتی ہے۔ وہ ہر آگے بڑھنے والے سے، بلکہ کسی بھی کمزور ترین اقدام کرنے والے سے اس کے ایک ایک قدم پر ٹیکس وصول کرتی ہے۔ یہاں بھی مقابلہ درپیش ہے جو جتنا زیادہ دے سکے، اتنا ہی فائدہ اُٹھا لے۔

کتنے ہی بڑے بڑے سرکاری اداروں اور صنعتی کاروباروں اور قومی فنڈز میں غبن اور خیانت کے واقعات اخبارات میں آ چکے ہیں۔

علاوہ ازیں زمین کا انتقال کرانا، رجسٹری کراتا، بجلی یا سوئی گیس کا میٹر حاصل کرنا، ٹیلی فون لگوانا، رسلے کا ڈیکلریشن حاصل کرنا، پاسپورٹ لینا، گاڑی یا اسلحہ کا لائسنس، ڈومیسائل سرٹیفکیٹ، آئیڈینٹی کارڈ یا ویزا لینا، ریڑھی چلانا، کھوکھا نصب کرنا، خوانچہ لگانا ہر مسئلہ جو پیش آئے گا۔ اس کے لیے کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ نذرانہ دینا پڑے گا۔

بات بات پر دفتروں کے چکر کھا کھا کر، تھانوں اور عدالتوں کے رگڑوں سے گزر کر ناکام ہونے والے مصیبت زدہ لوگ جب جینے سے بیزار ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے ہفتے دس دن کے میچوں کا ایسا انتظام کیا جاتا ہے کہ تمام کام بند رہتے ہیں۔ ان کے لیے ناچ مجروں کے انتظامات ہوتے ہیں۔ سُودی فائدوں اور جُوئے کی دلفریبیوں کے نئے نئے تجربے سامنے لائے جاتے ہیں۔ گندی ثقافت کے نقش جلوے ان کے سامنے بکھیرے جاتے ہیں تاکہ تفریح کی مستی میں اخلاق بھی خراب ہوں اور اسلام سے دُوری بھی بڑھے۔ اور زندگی سے مقصدیت کی رُوح بالکل ختم ہو جائے۔

یہی عوام ہیں جن کے نام پر سارا نظامِ جمہوریت چلتا ہے اور تمام اکابر اپنے آپ کو

انہی کا خادم قرار دیتے ہیں۔

اوپر سے اب تک جس ہمہ گیر طلسم کا نقشہ ہم نے کھینچا ہے اس نے نہ صرف تمام اسلامی قدریں بلکہ انسانیت کی خوبیاں بھی پیس کر رکھ دی ہیں۔ حلال و حرام کا قصہ ختم۔ ذکرِ خدا نہیں، شکرِ خدا نہیں، خوفِ خدا نہیں، محبتِ رسولؐ نہیں، محاسبۂ آخرت کا تصور نہیں۔ البتہ کچھ نمائشی رونق میلے مذہب کے نام پر بھی زور شور سے ہوتے رہتے ہیں۔

بڑے لوگ سب کے سب گوشت پوست کے بنے ہوئے روبوٹ بنتے جا رہے ہیں، جن کا ہنسنا، رونا، بولنا، اعلان کرنا، وعدے کرنا، ملنا جلنا سب کچھ اخلاص سے خالی مشینی عمل ہے۔

دراصل یہی وہ عناصر ہیں جنہوں نے قوم کی قوم کو غلامی در غلامی میں جکڑ دیا ہے۔ اور بچے بچے کا بال بیرونی قرضوں میں باندھ کر ہر کسی کو بے دست و پا کر دیا ہے۔

انگریزی ہم پر جبراً ٹھونسی جا رہی ہے، سیکولرازم ہم پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ عیاشی اور فحاشی کو خوب فروغ دیا جا رہا ہے، اسلام سے ہم کو دور دھکیلا جا رہا ہے، تعلیمی اداروں کی فضا کو دھواں دھار بنایا جا رہا ہے۔ اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ان مسائل سے سیاسی جماعتیں بے تعلق ہیں، لیڈروں کو ہماری اس مصیبت کا علم نہیں، دانشوروں کی ادھر توجہ نہیں، ذرائع ابلاغ بے نیاز ہیں، بلکہ وہ خود اخلاقی و تہذیبی سیلاب ہلاکت کو اوپر لانے میں مددگار ہیں۔

دریں احوال اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام اور انسانیت کو اپنے روڈ رولر کے نیچے پیسنے والی ان قوتوں سے کیسے نجات ملے۔

میں یوں سمجھتا ہوں کہ ہم اگرچہ ایک قفس میں بند ہیں اور اس کے گرد خاردار تاروں کی ایک گرل سی بنی ہوئی ہے اور یہ قفس غلامانہ ذہنیت رکھنے والے عناصر کے ذوقِ غلامی کی زنجیر میں لپٹا ایک سپر پاور کی شاخ سے اچھی طرح بندھا ہے اور اس زنجیر کا ایک چھوٹا سا حصہ دوسری سپر پاور کی شاخ سے بھی اُلجھا ہوا ہے۔

مگر اس کے باوجود ساحرانہ اور ظالمانہ حالات کے خلاف کسی بھی وقت ایک ایسی انقلابی رَو اُٹھ سکتی ہے کہ جادو کا یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے اور ہم ایک خوددار اور بیدار دل ملتِ اسلامیہ

کی حیثیت سے یہ اعلان کرتے ہوئے نمودار ہوں کہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام ہمارا نظام اور ہماری تہذیب ہے اس کے نقطے نقطے، شوشے شوشے کو ہم زندہ کریں گے۔ اور ہمیں ملّا اور رجعت پسند کہہ کر کوئی قوت مخالف اسلام سپر پاورز کے قدموں سے روندوا نہیں سکتی جو "بنیاد پرستی" کے عنوان سے ہمارے خلاف ایک طوفانِ نفرت و مخالفت برپا کیے ہوئے ہے۔

اگر یہ حیرت ناک بات ممکن ہے کہ علوم و وسائل کی انتہائی پسماندگی اور قلتِ تعداد کے باوجود افغانیوں نے روس کی ہولناک قوت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، اگر یہ ممکن ہے کہ عین ماسکو میں نہ بہ نہ جبریت کے باوجود دو آدمی افغانیوں پر روس مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، اگر یہ ممکن ہے کہ اسرائیل ہی کے اندر سے ایک طاقت اس کی مسلم کش ظالمانہ پالیسیوں کے خلاف علی الاعلان باغی ہو جاتی ہے تو پاکستان کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ یہاں تو لوگوں کو کتنا بھی بگاڑا جائے، یہ لوگ قرآن و حدیث کے اسلام کو ترک کر کے لادینیت کو اصولی اور سیاسی و قانونی طور پر اختیار نہیں کر سکتے۔ دس بار مغالطے کھا کر بھی وہ آخر میں اطمینان صرف اس وقت حاصل کر سکیں گے جب وہ دیکھ لیں گے کہ پاکستان کا مطلب عملاً لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہو گیا ہے۔

اب ساری ذمہ داری ایسے لوگوں کے سر عاید ہوتی ہے جو سچے دل سے غلبۂ اسلام چاہتے ہیں۔ اس کام کے لیے موجودہ مزاحم عوامل کو راستے سے ہٹا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ایسے حضرات پر یہ واضح رہے کہ ایسی بڑی تبدیلی بغیر اس کے نہیں آسکتی کہ کسی نظریۂ اساسی اور طریقِ انقلاب اور نظامِ مطلوب اور تغیراتِ لازم کے متعلق آبادی کی ایک معتدبہ ذی شعور تعداد بات کو اچھی طرح سمجھ نہ لے۔ ٹارگٹ کم سے کم یہ ہونا چاہیے کہ سال دو سال میں ایک کروڑ افراد تحریکِ اسلامی کی ضروریات کے مطابق مطلوبہ معیار تک پہنچ جائیں۔

ایسا ہوا تو قفسِ متشدث بھی ٹوٹ جائے گا، خار دار تاروں کی گرل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی، زنجیریں بھی پگھل جائیں گی اور پنجرے کی تیلیوں کے جوڑ بھی کھل جائیں گے۔

ورنہ مخالف قوتیں مزاحمت کی دیواروں کو اور زیادہ اونچا، اور زیادہ دبیز کر لیں گی!